افتخار عارف کی شاعری

ڈاکٹر شیر علی

ABSTRACT:
This is the most important achievement of a poet and writer to create and establish his or her own style. By studying all the great poets and writers of world, one can easily recognize their style and diction. For example, in Urdu literature, one can easily recognize the style and diction of Mir, Ghalib and Iqbal etc. Iftikhar Arif has also been successful to create his own style by coining his own compounds and diction. In this brief article, his poetry has been studied to analyze his style and especially to highlight his experiences of Hajrat.

کسی بھی ادیب یا شاعر کی سب سے بڑی کامیابی اپنے انفرادی اُسلوب کی تشکیل و تخلیق ہے۔ افتخار عارف کا کلام اپنے ڈکشن، لہجے اور طرزِ اظہار کے حوالے سے اپنی مخصوص انفرادیت کا حامل ہے۔ ''کتابِ دل و دنیا'' کے نام سے ان کا شعری کلیات مکتبۂ دانیال کراچی سے ۲۰۱۲ء میں شائع ہو چکا ہے جس میں ان کے شعری مجموعے ''مہرِ دو نیم''، ''حرفِ باریاب'' اور باقی سب کلام شامل ہے۔ افتخار عارف نے چودہ برس تک ''اردو مرکز، لندن'' کے سربراہ کی حیثیت سے برطانیہ میں شعر و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے بہت کام کیا۔ اردو مرکز لندن کی طرف سے کئی کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی۔ فیض احمد فیضؔ کا کلیات ''سارے سخن ہمارے'' کے نام سے پہلی دفعہ اردو مرکز، لندن نے ہی شائع کیا۔

افتخار عارف کی غزل روایت کے کلی ادراک اور پاسداری کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کی تمام پیچیدگی اور جدت آفرینی کی بہترین مثال ہے۔ ان کے شعر کا آہنگ اپنی مخصوص لفظیات ، تشبیہی، استعاراتی اور علامتی نظام کی بنا پر خاص انفرادیت کے ساتھ ساتھ غضب کی تاثیر کا حامل ہے۔ ان کے محسوسات و جذبات کی سچائی اور شدت نے ان کے شعر کو دلآویز دردمندی کا حامل بنا دیا ہے۔ افتخار عارف اپنے احساسات اور تفکرات پر جھوٹ، مکر اور فریب کاری کا سایہ تک نہیں پڑنے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان معدودے چند شعرا میں شامل ہیں، جن کے لہجے کی سچائی جمالِ شعر کی ضامن بن چکی ہے اور اس رویے نے ان کے شعر کو جرأت اور بے باکی کا حامل ٹھہرایا ہے :

کہاں کے نام و نسب علم کیا فضیلت کیا
جہانِ رزق میں توقیر اہلِ حاجت کیا
شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں ، ہم کیا ہماری ہجرت کیا

دمشقِ مصلحت و کوفۂ نفاق کے بیچ
فغانِ قافلۂ بے نوا کی قیمت کیا (۱(

افتخار عارف کی غزل میں ''دیارِ نور'' میں ''تیرہ شبوں'' اور ''وحشتوں'' کے ''ساتھی'' کا ذکر رعنائی اور دلآویزی کا حامل ہے۔ شاعر انسان کے بطون میں شامل محسوسات و جذبات کے اظہار میں پوری طرح کامیاب ہوا ہے۔ ان کی غزل میں مہاجرت کا کرب بھی پوری شدت سے بیان ہوا ہے:

دیارِ نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو
عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا
کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا (۲(

افتخار عارف کی شاعری بنیادی طور پر انسان کے داخلی جذبات و محسوسات کی شاعری ہے اور یہی عنصر ان کی شاعری کی اثرآفرینی کا باعث ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں یہ سب داخلی جذبات و محسوسات شاعر کے بطن سے پھوٹتے ہیں۔ ان کی نوعیت روایتی مضامین کے اظہار کی سی نہیں یعنی یہ سب محسوسات و جذبات برائے شعر گفتن کے زمرے میں نہیں آتے بل کہ شاعر کی دل کی بھٹی میں تپ کر نمو پذیر ہوتے ہیں:

ابھی سے برف الجھنے لگی ہے بالوں سے
ابھی تو قرضِ مہ و سال بھی اتارا نہیں
بس ایک شام اُسے آواز دی تھی ہجر کی شام
پھر اس کے بعد اُسے عمر بھر پکارا نہیں
سمندروں کو بھی حیرت ہوئی کہ ڈوبتے وقت
کسی کو ہم نے مدد کے لیے پکارا نہیں
ہم اہلِ دل ہیں محبت کی نسبتوں کے امین
ہمارے پاس زمینوں کا گوشوارا نہیں (۳(

افتخار عارف کی غزل میں ایک عجب پراسرار فضا محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس فضا کی تشکیل میں وہ کئی وسیلوں سے کام لیتے ہیں جن میں ان کی غزل کا اساطیری اور تلمیحاتی انداز بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے:

کسی اہلِ ہجر کی بد دعا ہے کہ خود سری کا قصور ہے
یہ جو بات بن کے بگڑ رہی ہے تو کوئی بات ضرور ہے

مری بے گھری مجھے کیسے کیسے دروں گھروں پہ لیے پھری
مرا واہمہ تھا کہ میرے رختِ سفر میں جوہرِ نور ہے (۴(

مذکورہ بالا پراسرار اور اساطیری فضا کے ساتھ ساتھ ان کی غزل میں شاعری کی پوری روایت کے نمایندہ نقوش کی بنا پر بھی ایک عجیب خوب صورتی اور دلآویزی کی کیفیت نمایاں ہوئی ہے۔ اس

کیفیت کی تخلیق میں شاعر نے کہیں کہیں اساتذہ کے محسوسات کو اور کہیں کہیں ان کے طنطنے کو بہ طرزِ نو بیان کیا ہے:

وحشت کا اثر خواب کی تعبیر میں ہوتا
اک جاگنے والا مری تقدیر میں ہوتا
مہتاب میں اک چاند سی صورت نظر آتی
نسبت کا شرف سلسلۂ میرؔ میں ہوتا

مرتا بھی جو اس پر تو اسے مار کے رکھتا
غالبؔ کا چلن عشق کی تقصیر میں ہوتا (۵(

افتخار عارف کی غزل میں صدیوں پر محیط اعلیٰ اخلاقی اقدار کا بیان کچھ اس انداز سے ہوا ہے کہ یہ سب اخلاقی اقدار نہ صرف اعلیٰ و ارفع زندگی کے لیے ناگزیر ٹھہرتی ہیں بل کہ ''حرمتِ لفظ'' کا جزو لاینفک بھی قرار پاتی ہیں۔ ان کی غزل میں کچھ ایسے تلخ حقائق بھی بیان ہوئے ہیں جن کا اظہار دوسرے شعرا کے ہاں شاذ و نادر ہی نظر آتا ہے۔ مثلاً بے گھری کا عذاب تو ایک معلوم و معروف چیز ہے لیکن اپنے ہی گھر میں ''ماں'' کے قدموں میں بھی ''جنت'' سے محرومی کرب ناک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نیا شعری رویہ ہے:

سخنِ حق کو فضیلت نہیں ملنے والی
صبر پر دادِ شجاعت نہیں ملنے والی
ہوسِ لقمۂ تر کھا گئی لہجے کا جلال
اب کسی حرف کو حرمت نہیں ملنے والی
گھر سے نکلے ہوئے بیٹوں کامقدر معلوم
ماں کے قدموں میں بھی جنت نہیں ملنے والی (۶(

افتخار عارف کی نظم ان کی غزل کی طرح اپنے اسلوب اور موضوعات کی انفرادیت کی بنا پر بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ان کے ہاں روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو پوری فکری اور جذباتی گہرائی کے ساتھ عصرِ جدید کی ذہنی اور جذباتی الجھنوں کے بیان کے حوالے سے متاثر کن پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس نوع کی نظموں میں سب سے اہم نظم ''بارھواں کھلاڑی'' ہے۔ بارھویں کھلاڑی کو ایک علامت بنا کر اس کے محسوسات اور کیفیات کے وسیلے سے شاعر نے بڑی کامیابی کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی سطح پر پوری انسانیت کے جذبات و محسوسات کی عکاسی کی ہے:

بارھواں کھلاڑی بھی
کیا عجب کھلاڑی ہے
انتظار کرتا ہے
ایک ایسی ساعت کا
ایک ایسے لمحے کا

جس میں سانحہ ہو جائے
پھر وہ کھیلنے نکلے
تالیوں کے جھرمٹ میں
ایک جملۂ خوش کن
ایک نعرۂ تحسین
اس کے نام پر ہو جائے (۷)

افتخار عارف نے اپنی ایک مختصر نظم ''ہجرت'' میں ہجرت کے تجربے کو بہت ہی خوب صورت تمثیل کے ذریعے بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک ہجرت کرنے والے انسان کی مثال اس پرندے کی طرح ہے جو ہرے بھرے چھتنار درختوں کو چھوڑ کر بجلی کے ننگے تاروں پر بیٹھ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہال ہو جاتا ہے اور یوں بے سمجھے بوجھے انجانے رستوں پر چلنے والوں کی ایک کھلی مثال بن جاتا ہے۔ ان کی نظم ''ٹیمز کے ساحل پر'' ماضی سے وابستہ ایک جذباتی کردار کی عکاسی پر مبنی ہے۔ اسی طرح ان کی نظم ''تجاہلِ عارفانہ'' میں اپنی مٹی کی بو باس اور پھولوں کی خوشبو کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس حوالے سے مادہ پرست اہلِ زر کی کم نظری کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

مغرب کا معاشرہ مشرقی معاشرے سے تہذیبی، ثقافتی اور سماجی سطح پہ بالکل مختلف معاشرہ ہے۔ افتخار عارف کی نظم ''بدشگونی'' میں مذکورہ بالا معاشرتی تفاوت دل چسپ علامتی اُسلوب میں بیان ہوا ہے۔ نئے نئے منظروں کی خواہش میں اپنے منظر سے کٹ جانے کا کرب اور نئے نئے دائروں کی گردش میں اپنے محور سے ہٹ جانے کی تکلیف اور اداسی اس نظم کا بنیادی موضوع ہے۔ انسان مغرب کی غیر یقینی فضا میں امید، امکان، خوف، ناامیدی ہزارخانوں میں بٹ جاتا ہے۔ شاعر کے دل میں ''رات'' ہونے سے پہلے واپس لوٹ جانے کی آرزو بڑی درد مندی کی حامل ہے۔ وہ ہوا و حرص و ہوس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ برطانیہ کے بے حس ماحول میں جذبوں اور خوابوں کے برفاب ہونے کی داستان ان کی نظم ''پس چہ باید کرد ۔ ۔ ۔ '' میں بڑے سلیقے سے بیان ہوئی ہے۔ راقم الحروف کے استفسار پر افتخار عارف نے مذکورہ بالا دونوں نظموں ''بدشگونی'' اور ''پس چہ باید کر ۔ ۔ ۔ '' کے تہذیبی منظرنامے کے حوالے سے اس بات کی توثیق کی کہ ان نظموں کا تعلق برطانوی تہذیب و ثقافت کی عکاسی پر مبنی ہے۔ برطانیہ کی یخ بستہ زمینوں میں موجِ خوں، انسانی سانسیں، خواب بُنتی آنکھیں، یارانِ دلآویز کی یاد، ہر نام، ہر آواز، ہر چہرہ برف بن جاتا ہے:

پس چہ باید کرد ۔ ۔ ۔
خوابِ خس خانہ و برفاب کے پیچھے پیچھے
گرمیِ شہرِ مقدر کے ستائے ہوئے لوگ
کیسی یخ بستہ زمینوں کی طرف آ نکلے

موجِ خوں برف ہوئی جاتی ہے ، سانسیں بھی ہیں برف
وحشتیں جن کا مقدر تھیں ، وہ آنکھیں بھی ہیں برف

یادِ یارانِ دل آویز کا منظر بھی ہے برف
ایک اک نام ، ہر آواز، ہر اک چہرہ برف
منجمد خواب کی ٹکسال کا ہر سکّہ برف
اور اب سوچتے ہیں ، شام و سحر سوچتے ہیں
خوابِ خس خانہ و برفاب سے وہ آگ بھلی
جس کے شعلوں میں بھی قرطاس و قلم زندہ ہیں
جس میں ہر عہد کے ہر نسل کے غم زندہ ہیں
خاک ہو کر بھی یہ لگتا تھا کہ ہم زندہ ہیں (۸(

افتخار عارف کے ہاں حمد، نعت، سلام اور منقبت کے حوالے سے اعلیٰ شعری نقوش ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے مذکورہ بالا تمام اصناف کی جذباتی دنیا میں ڈوب کر اپنے جذبے کا اظہار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شعری اظہار محض اظہارِ شعر تک محدود نہیں بل کہ ان کے باطن کے آئینہ خانے کی تصویر گری ہے۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی عقیدت اور انکساری ان کی شاعری کو ایک نیا لہجہ اور نیا رنگ و آہنگ عطا کرتی ہے:

مرا شرف کہ تو مجھے جوازِ افتخار دے
فقیرِ شہرِ علم ہوں زکوٰۃِ اعتبار دے
میں جیسے تیسے ٹوٹے پھوٹے لفظ گھڑ کے آ گیا
کہ اب یہ تیرا کام ہے بگاڑ دے سنوار دے
مرے امین آنسوؤں کی نذر ہے قبول کر
مرے کریم اور کیا ترا گناہ گار سے (۹(

افتخار عارف کے ہاں اس نوع کی شاعری کے حوالے سے ایک عجیب جذباتی کیفیت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ قاری شاعر کی جذباتی سچائی اور شاعرانہ آہنگ سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ پاتا۔ اس نوع کی شاعری ایک مخصوص پیرایۂ اظہار کی متقاضی ہوتی ہے۔ افتخار عارف کے ہاں وہ جذباتی اور روحانی پیرایۂ اظہار اور اُسلوبِ بیاں نظر آتا ہے:

مدینے کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا
جلال ایسا کہ دل سینے سے نکلا جا رہا تھا
دعا بعد از دعا ، سجدہ بہ سجدہ ، اشک دَر اشک
میں مشتِ خاک تھا اور پاک ہوتا جا رہا تھا
مدینہ و نجف و کربلا میں رہتا ہے
دل ایک وضع کی آب و ہوا میں رہتا ہے (۱۰(

اردو شاعری میں کربلا کا حوالہ ایک ہمہ گیر استعارے کے طور پر سامنے آیا ہے۔ کربلا کا استعارہ صرف مذکورہ واقعے تک محدود نہیں رہتا بل کہ ہر نوع کے جبر و استبداد کے خلاف ''کلمۂ حق'' کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ شعری رویہ اور علامت دنیا بھر میں نسلِ انسانی کے حوالے سے ہر طرح کے

استحصالی فکر و عمل کے خلاف نعرۂ جہد و عمل بن کر نمودار ہوتا ہے۔ افتخار عارف کے ہاں بھی سانحۂ کربلا اسی ہمہ گیری اور اثرآفرینی کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ ان کے اس شعری رویے کے حوالے سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''افتخار عارف کے ہاں یہ رجحان ایسی محویت اور تخلیقی شان سے اظہار پذیر ہوا ہے کہ اس کے شعری شناخت نامے کا ناگزیر حصہ بن گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ واقعۂ کربلا اور اس کے تعلیقات کا نئے سماجی انسانی مفاہیم میں استعمال یوں تو اَوروں کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن افتخار عارف کے تخلیقی وجدان کو اس سے جو گہری مناسبت ہے، اس کی نئی شاعری میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ افتخار عارف کے یہاں یہ بات اُن کے تخلیقی عمل کے بنیادی محرک کا درجہ رکھتی ہے کہ وہ لمحہ موجود کی پیچیدہ سیاسی، سماجی، اخلاقی اور انسانی صورتِ حال کو ایک وسیع تاریخی تناظر میں دیکھتے ہیں۔'' (۱۱(

حوالے:

)۱(افتخار عارف، کتابِ دل و دنیا۔ کراچی: مکتبۂ دانیال، ۲۰۱۲ء، ص۱۸۲

)۲(ایضاً ، ص۲۰۵، ۲۰۷

)۳(ایضاً ، ص۲۱۱-۲۱۲

)۴(ایضاً ، ص۲۸۰-۲۸۱

)۵(ایضاً ، ص۲۸۷-۲۸۸

)۶(ایضاً ، ص۲۹۱-۲۹۲

)۷(ایضاً ، ص۴۶۴-۴۶۵

)۸(ایضاً ، ص۵۳۲-۵۳۳

)۹(ایضاً ، ص۷۹

)۱۰(ایضاً ، ص۸۶، ۸۹

)۱۱(ایضاً ، ص۵۳

/...../